

دو مذہبی نظام ہائے فکر

تقلید سے اور تخلیق سے

الطاف جاوید

خود تنقیدی (SELF-CRITICISM) جسے حضرت علامہ اقبال نے ان الفاظ میں پیش فرمایا

ہے یہ صورتِ شمشیر ہے دستِ تصنیف میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زمان اپنے عمل کا حساب

خود تنقیدی دراصل اُمم کی بقا و ترقی کے لئے ایک بے حد ضروری عمل ہے۔ اپنی کمزوریوں، خامیوں اور کوتاہیوں کا ہر دم جائزہ لیتے رہنا زندہ اور حرکت پذیر ہونے کی علامت ہے۔ قرآن حکیم نے لفظ 'استغفار' کو خود تنقیدی کے معنوں میں استعمال فرمایا ہے۔ جب ہم استغفار کرتے ہیں تو درحقیقت اپنی کوتاہیوں اور بے راہ رویوں پر خود تنقید کر رہے ہوتے ہیں۔ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب اپنے مشن کو مکمل کر لیا تو سورہ نصر جو قرآن حکیم کے سلسلہ نزول میں سب سے آخری سورت ہے، حتی تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی، جس میں لادنی برحق کی وفات کے بعد رہتی دنیا تک بدلتے ہوئے مختلف تاریخی ادوار میں اُمّتِ مسلمہ کے استحکام و ارتقاء کے لئے جو لائحہ عمل بتایا گیا ہے، وہ یہی خود تنقیدی کا اصول ہے، دینِ حق میں عرب قبائل کے جوق درجوق اور قافلہ در قافلہ شامل ہونے کے بعد تبیخ، حمد اور استغفار کے اصول تلقین فرمائے گئے۔

ذاتِ باری تعالیٰ کی تبیخ کرتے وقت دراصل ہم تشبیہ سے تخریب، کثرت سے وحدت، مقابہ سے آفاقیت، جانبداریت سے غیر جانبداریت اور مادہ سے نور کی طرف ذہنی سفر کرتے ہیں اور تبیخ کے ان مضمرات کا اپنی داخلی اور خارجی زندگی میں تحقق ہی نایتِ حیات ہے۔ کیوں کہ ذات یا شخصیت کی تکمیل و صلابت کا عمل جہاں محیط سے مرکز کی طرف آتا ہے، وہاں ادنیٰ اور محدود

دائرہوں سے نکل کر اعلیٰ اور وسیع تر دائروں میں قدم بھی رکھتا ہے۔

مگر بشری حیثیت سے ہمیں کسی حقیقت یا غایت کو حاصل کرنے کے لئے تسخیرِ فطرت اور معاشری عمل کے امتزاج سے گزرنا لازمی ہے۔ اور ہم تسخیرِ فطرت سے جن نئے حقائق کا انکشاف کرتے اور معاشری ارتقار سے جن اعلیٰ سے اعلیٰ منازل کا حصول عمل میں لاتے ہیں، اُن نئے حقائق اور اعلیٰ منازل کی حیرت انگیز نیرنگیوں اور بے پناہ عظمتوں سے ایک طرف تو ہمارے قلوب حمدِ الہی کے لغات سے بھر جاتے ہیں، مگر دوسری طرف فطری حقائق کے انکشاف سے جو قوت ہمارے ہاتھ آتی ہے، اُس کے صحت منداستعمال اور معاشری ارتقار کے ایک ادنیٰ مرحلہ سے اعلیٰ تر مرحلہ تک رسائی کے لئے ہماری حیات ذہنی اور عمرانی میں جو انتشار اور عدم استحکام پیدا ہوتا ہے، اُسے سالمیت اور استقلال میں بدلنے کا راستہ سیدھا اور یکسانیت کا حامل نہیں ہوتا۔ یہ راستہ اُن گنت غلطیوں کو تاہ نظر یوں اور مبالغہ آمیزیوں سے بھر پور ہوتا ہے، لہذا ہمارے پاس استغفار یا خود تنقیدی کا ہی ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے استعمال سے ہم ہر نئے دور کی معاشری اور نظری ذمہ داریوں سے اپنے عمل کی خامیوں اور فکری نارسائیوں کے احتساب سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

لہذا خود تنقیدی سے جن فکری اور نظری استقام، نفسی اور تعلیمی و اماندگیوں اور معاشرتی بے تا حدگیوں پر ہمیں اطلاع ملے تو ہمارا فرض ہے کہ اُن پر چراغِ پا ہونے اور مہلخ لہجہ اختیار کرنے کی بجائے اپنے ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے، اُن کی تعمیری اصلاح کرنے کی کوشش کریں۔ اب میں اپنے اصل موضوع پر آتا ہوں۔ عام طور پر مذہب کے بارے میں دو نظام ہائے فکر ہوتے ہیں۔ ایک تقلیدی اور دوسرا تخلیقی۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں اکثر علماء نے اول الذکر نظام فکر کو اپنا رکھا ہے، اور اُس پر وہ سختی سے قائم ہیں اور قائم رہنا چاہتے ہیں۔

مجھے یہاں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ہمارے یہ علماء اسلام ہی تھے، جن کی مخلص سچی وجہ کی برکت سے دینِ حق اپنی روایتی شکل میں آج ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ مذہبی دارالعلوم ہی ہیں جنہوں نے ہمارے قدیم مذہبی ورثہ کو آج تک محفوظ رکھا ہے۔ دن میں پانچ وقتِ حجتِ الٰہی الفلاح کی گونجتی ہوئی جانفز آواز، یہ مساجد، یہ درس و تدریس کا فوق و شوق، یہ قرآنِ حکیم کے حفاظ کی تیاری اور اسی طرح کے دیگر مذہبی اعمال کی انجام دہی انہی عالمانِ دین اور اُن کے

دارالعلوموں کی طفیل قائم ہے۔

اس اعتراف کے باوجود اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ پچھلے چھ صدیوں سے ان علومِ مذہب اور اداروں میں جمود اور زوال پذیری اپنے قدم جما چکی ہے۔ آج مذہبی فکر و عمل اپنی نوعیت میں تخلیقی ہونے کی بجائے تقلیدی بن چکا ہے۔

ہماری یہ حالت اور بھی قابلِ افسوس ہو جاتی ہے جب اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی کتابِ مقدس کے حامل ہیں جو کلماتِ الہی کے لاتناہی اور غیر منقطع ہونے کی تعلیم دیتی ہے۔ "اگرچہ روشنائی کے کئی سمندر اور روئے زمین کے تمام درختوں کی اقلام انہیں لکھتے ہوئے ختم ہو جائیں یہ کلماتِ الہی وجود اُس کے مظاہر اور اُن کے مضمرات کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ یہ حق تعالیٰ ہی ہے جو وجود اور اُس کے مظاہر کا اول و آخر بھی ہے اور ظاہر و باطن بھی۔ یہ اللہ ہی ہے جس کا نور سمادات و ارض میں پھیلے ہوئے مظاہر وجود کی صورت میں ہم پر عیاں ہو رہا ہے۔ اور یہ وجود مطلق ہی ہے جو ہر آن اپنی نئی شان میں جلوہ گر رہتا ہے۔

لہذا تافلہ وجود کی رفتار و حرکت میں کہیں بھی اور کسی بھی لمحہ ٹھہراؤ کو تسلیم کرنا قرآن کی حکمتِ بالغہ کے خلاف ہوگا۔ کیوں کہ قرآن اپنے فکری عمل میں جسمود اور رجعت پسندی کو کسی شکل میں بھی قبول نہیں کرتا۔

چوں کہ زمان و مکان کے اس محسوس مرحلہ میں کوئی شے یا شخصیت مکمل نہیں ہے۔ لہذا تنقید سے گھبرانے کی بجائے اُسے لبیک کہنا چاہیے۔ کیوں کہ تنقید ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ ہم اپنے انفرادی اور ملی وجود اور اُس کے تقاضوں کو مکمل کر سکتے ہیں۔ تنقید بد صورتی کی تہ میں چپے ہوئے حسن کو کمرئید کہ باہر لانے کا نام ہے۔ تنقید ایک آئینہ ہے جس میں ہم اپنے چہرے کے داغ بھی دیکھ سکتے ہیں اور اپنے حسن کو بھی۔ تنقید بدن کے اُس حصہ کی نشان دہی کرتی ہے جہاں بیماری اپنا قبضہ جما چکی ہے اور عیاں ہے کہ طبقہٴ علماء میں بھی پانچوں انگلیاں ایک جلیسی نہیں ہیں۔ تنقید عمل کے لئے مہینز کی حیثیت رکھتی ہے۔

اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ تنقید کرنے والا ذہن آسمانی نہیں ہوتا۔ وہ بھی آتی وجود کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ ملت کی نومندی یا کمزوری سے وہ بھی متاثر ہوتا ہے، مگر فرق صرف

اتنا ہے کہ وہ بے لوث، غیر جانب دار اور مخاد پرستی سے انگ ہو کر جب مطالعہ کرتا ہے تو اس قابل ہو جاتا ہے کہ معدومہی حقیقت میں اگر کہیں جھول آچکا ہے تو اُسے درست کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہ سمجھنا بھی شدید غلطی ہے کہ علماءِ مذہب وجودِ مٹی سے مادہ اور وجود رکھتے ہیں۔ یہ بزرگ شخصیتیں ملت کے وجود کا ایک قابلِ قدر حصہ ہیں، لہذا ان پر تنقید دراصل اپنے آپ پر اور پورے مٹی وجود پر تنقید کرنے کے مترادف ہے۔ کیوں کہ جسم کے ایک حصہ کا بگاڑ پورے جسم کی صحت اور قوت کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ غلطی اور کجی ہر عضو میں پیدا ہو سکتی ہے۔

لہذا حق تعالیٰ کی نئی شان اور اُس کے تقاضوں کے مطابق اگر مذہبی علوم اور اداروں میں مناسب تبدیلیاں عمل میں لانے کا مشورہ دیا جائے تو اُس پر چین بچیں ہونے کی بجائے، حمد و ثناء خورد و فکر کرنا ہی مومنانہ فراسٹ کی دلیل ہے۔

مذہبی تقلیدی نظام سے مراد کوئی فرد یا افراد کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک فکری اور تعلیمی رویہ ہے جو مذہب اور مذہبی مسائل کے متعلق اختیار کیا جاتا ہے اور اس طرح تصورات و عقائد کا ایک نصف مرتب کرتا ہے، جو دوسرے نظاماتِ فکر سے اپنی ماہیت میں منفرد ہوتا ہے۔ اس نظام کا مفہوم دراصل نظامِ حکمت کے مفہوم کے برعکس معانی کا حامل ہے، اور نظامِ حکمت سے مراد فلسفہ اور سائنس دونوں ہیں۔ کیوں کہ حقیقتِ اولیٰ کی تلاش میں یہ دونوں آزاد اور تخلیقی تحقیق سے کام لیتے ہیں اس لئے یہ اپنی تلاش کے دوران پہلے سے مقرر شدہ اور بندھے ہوئے منہاج پر نہیں چلتے بلکہ اپنا راستہ اور نظامِ عمل خود مقرر کرتے ہیں یہ معاشرہ میں رائج الوقت عقائد اور رسوم و اعمال کی عقلی اساس پر جرح و تنقید کرتے ہیں تاکہ معاشرتی عمل اپنے ارتقائی مراحل آسانی سے طے کر سکے۔

ہم جس عہد میں سائنس لے رہے ہیں، اس عہد کی عقلیت استقرائی، تخلیقی اور معاشرتی عقلیت ہے جو عقلِ قیاسی سے اپنی کیفیت اور مافیہ دونوں میں بالکل مختلف ہے، کیوں کہ عقلِ قیاسی کے نظامِ فکر میں حقیقت صرف بسیط، لامکانی و زمانی مطلق، واجب اور کلی تصور کی جاتی ہے مگر عہدِ حاضر کی استقرائی، تخلیقی اور معاشرتی عقلیت حقیقت کے اس تصور کو غیر مکمل اور یک طرفہ سمجھتی ہے۔ اُس کے نزدیک مذکورہ اقدار کے ساتھ جب تک مرکب، زمانی و مکانی، اضافی اور

ممکن و جزئی کے تصورات کو شامل نہ کیا جائے حقیقت کی کامل توجیہ نہیں ہو سکتی۔

حقیقت ایک نامیاتی کُل ہے جو ان دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک دوسرے کے متضاد ہوتے ہوئے بھی اپنے کُل کے اندر پوری طرح متحد ہوتے ہیں۔ حکمت و وجود اور اُس کے مظاہر کو وقت کے سیلان میں واقع تسلیم کرتی ہے۔ وقت کے سیلان کے باہر کسی مظہر کو نہیں مانتی۔ چونکہ فطرت معاشرہ اور ذہن کا ہر مظہر وقت کے سیلان میں واقع ہے، اسی لئے اس کی اساسی قدر تغیر، حرکت اور ارتقا ہے۔ حکمت حیاتِ قوی کے نشوونما کے لئے ایسی ہی ضروری ہے، جیسے پودے کے لئے پانی۔ ترقی پذیر اقوام اپنے فکر و عمل کی اساس حکمت پر رکھتی ہیں۔ حکمت ہمیشہ حال سے استقبال کی طرف قدم بڑھاتی ہے اور افکار و قوانین کے کسی ایسے نظام کو قبول نہیں کرتی جسے ماضی میں پہلے سے تیار کر لیا گیا ہو۔ حکمت وہ گنج گراں مایہ ہے، جسے تمام آسمانی ہدایتیں اپناتی رہی ہیں بلکہ ان کی تعلقین کرتی رہی ہیں۔ قرآن حکیم اسے خیر کثیر کے عظیم لفظ سے یاد کرتا ہے۔

اس کے برعکس مذہبی تقلیدی نظام فکر عام طور پر عقل قیاسی پر اپنی اساس رکھتا ہے اور اسی سے مسائلِ حیات کے متعلق سوچنے اور انہیں حل کرنے کی تکنیک بھی حاصل کرتا ہے۔ یہ وجود، فکر اور ان کے مظاہر کو وقت کے سیلان سے باہر واقع تصور کرتا ہے۔ اس لئے انبیاء اور ان کے ممتاز متبعین کے وقتی فیصلوں کو دائمی حیثیت دے دیتا ہے۔ یہ حال سے ماضی کی طرف لوٹتا ہے اس لئے یہ حرکت کے تخلیقی نہیں، میکانیکی تصور کو اپناتا ہے۔ یہ جمود، روایت پرستی اور متشدد قدامت پسندی کا قائل اور تعمیر و ارتقا کا دشمن ہوتا ہے۔ مُردہ اور زوال پذیر طبقات اسے اپنا سرمایہ حیات بناتے ہیں اور اس طرح موت اور ظلمت کی وادیوں کی طرف سرگرم سفر رہتے ہیں۔

یہ مذہبی تقلیدی نظام صرف مسلمانوں سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ زرتشتیوں کے مُوہد، یہودیوں کے ربی، بدھوں کے بکشو، ہندوؤں کے برہمن اور عیسائیوں کے پادریوں پر مشتمل ہے۔ چونکہ یہاں مخاطب محض مسلمانوں سے ہے اس لئے تحریر کا موضوع صرف مسلم مذہبی دانش ہے۔ اس مذہبی تقلیدی نظام کے استقرائی مطالعہ سے اس کی چند تاریخی خصوصیات سامنے آتی ہیں۔ یہ خصوصیات تاریخِ عالم میں ہر مذہب کی مذہبی قیادت کے ساتھ وابستہ رہی ہیں۔

اگر ان خصوصیات کا ایک مختصر سا جائزہ لیا جائے تو اس کے حقیقی حدود و خال کو پہچاننے میں کافی مدد

ٹے گی۔

پہل خصوصیت عقیدہ پرستی

عقیدہ سے مراد فطرت، اساج اور شعور کے متعلق وہ تمام بنیادی اصول و قوانین ہیں، جو کسی مذہب کے نظام حیات کی اساس بنتے ہیں۔ عقائد اس لئے تشکیل پاتے ہیں کہ وہ عمل کے لئے مشعل راہ کا کام دیں۔ عقائد و نظریات عمل کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آتے ہیں۔ عقیدہ اور عمل میں ایک نامیاتی ربط و تعلق ہوتا ہے۔ عقائد و نظریات جہاں ذہن میں یقین پیدا کرتے اور اپنے حاملین کو عمل کا راستہ دکھاتے ہیں اور عملی راستہ کی پے چیدگیوں اور گمراہیوں سے بچنے کے لئے نشیب و فراز پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہاں وہ خود عمل کی کسوٹی پر کس کر اپنے آپ کو مکمل کرتے اور پُر مایہ بناتے ہیں۔

عقیدہ یا نظریہ کا اصل کام اپنے آپ کو عمل میں تحویل کرنا ہوتا ہے، جو عقیدہ اپنے آپ کو عمل میں نہیں بدلتا، وہ مُردہ لاش کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم نے نظریہ یا عقیدہ کے عمل سے باہمی ربط و تعلق کی نوعیت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:۔ یا ایہا الذین امنوا لعلکم تفلحون مالا تفلحون، کبر تبتاً عند اللہ ان تقولوا مالا تفلحون۔ (الصف) عقیدہ کو عمل میں بدلنے کی جدوجہد ہی وہ معیار اور محک مہیا کرتی ہے جس پر مختلف عقائد کی افادیت اور صداقت کو جانچا جاسکتا ہے۔

عقیدہ پرستی سے مراد یہ ہے کہ عقائد و نظریات کو ان کے الفاظ میں ٹھیک طرح سے یاد کر لینا، انہیں طوطے کی طرح زبانی رٹ لینا، نہ تو خارجی حقیقت سے ان کا تعلق پیدا کرنا اور نہ ہی معاشرتی عمل سے۔ اور بغیر کسی مزید سوچ، بچار کے ان عقائد کو ہر معاشرتی اور نفسی مرض کی دوا سمجھ لینا۔ عقیدہ پرستی عقیدہ اور عمل کے تعلق میں کوئی گہرا منطقی رشتہ قائم نہیں کرتی اور عقیدہ یا نظریہ کو عمل میں بدلنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ اُس کے لئے بس عقیدہ کی نوک پرک درست کر کے اُسے دہراتے رہنا ہی سب کچھ ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد محض عقیدوں کی تلقین کرنا ہی نہیں تھا بلکہ معاشرتی، نفسیاتی اور فکری زندگی کے دائروں میں ان کا عملی تحقق مقصود تھا۔ عقائد تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بلکہ ان سے بھی پہلے سے چلے آ رہے تھے، مگر حیاتِ معاشرہ سے جب بھی ان کا تعلق ٹوٹ جاتا تو کوئی نہ کوئی نبی مبعوث ہو کر اس تعلق کو پھر سے استوار کر دیتا تھا۔ کیوں کہ عقائد کا زبانی رٹ لینا یا دوسرے

کو ذہنی طور پر اُن کا قائل کر کے اپنے گروہ میں شامل کر لینا تو حیاتِ انسانی کے تزکیہ و ارتقار کے لئے کافی نہیں ہوتا۔

ایبار جس جماعت کی تنظیم کرتے تھے، اس جماعت کا مقصد ایسے افراد کو جمع کرنا نہیں تھا، جو اُن کے بقیہ کردہ عقائد کو محض زبانی طور پر تسلیم کر لیں، بلکہ ہر نبی کو ایسی جماعتوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے جو پہلے سے کسی مبعوث شدہ نبی کے نظام عقائد پر بن چکی تھیں، اور انہیں جماعتوں نے بعد میں آنے والے نبی کی بعثت اور تعلیمات کی شدید مخالفت کی۔ کیوں کہ نئے نبی کی جدوجہد سے اُن جماعتوں کے ذاتی مفاد اور معاشرتی مرتبہ کو زبردست نقصان پہنچتا تھا۔ بلکہ ایسے افراد پر مشتمل جماعت کا قیام مقصود تھا، جو اُن کے نظام عقائد کو مان کر اُن کی منشار کے مطابق معاشرتی زندگی کو بدلنے کی جدوجہد کریں۔

لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساری انسانی تاریخ مذہبی تقلیدی پیشوائیت کی عقیدہ پرستی اور ایبار کے انقلابی عمل اور تعلیمات کی باہمی آویزش کی تاریخ ہے۔

مسئلہ کی کامل تفہیم کے لئے ایک مثال پر غور کر لینا مفید ہوگا۔ عقیدہ توحید کو، جو تمام مذاہب کی تعلیمات میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، ماننے سے مراد محض یہی نہیں کہ خالق کائنات کو واحد تسلیم کر لیا جائے۔ بلکہ منشا الہی یہ ہے کہ اس عقیدہ کے مضمرات یعنی وحدتِ حیات، وحدتِ انسانیت اور وحدتِ ادیان کو معاشرتی سطح پر محسوس شکل میں ماہل کیا جائے اور ہر ایسی قوت اور طاقت کو راستہ سے ہٹا دیا جائے، جو ان مضمرات کو حاصل کرنے میں مانع ہو۔ تاکہ کرہ ارض پر بسنے والے تمام انسان اخلاقی عیال اللہ کے مصداق بن جائیں۔

پھر یہی نہیں کہ عقیدہ توحید کے مضمرات کے خارجی زندگی میں تحقق سے محض معروضی زندگی ہی تبدیل ہو جاتی ہے بلکہ خارجی زندگی کو تبدیل کرنے کے لئے جب ایک فرد جدوجہد کا آغاز کرتا ہے۔ تو اُس کی ذاتی نفسیات میں بھی تبدیلیاں واقع ہونے لگتی ہیں۔ اور تدریج اُس کی نفسی اور ذہنی حیات میں ایک انقلاب ظہور پذیر ہونے لگتا ہے۔ اب وہ دوسرے مذاہب اور نظاماتِ افکار سے نفرت کرنے کی بجائے اُن میں صداقت کے عنصر کو تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کیوں کہ اُس کا عقیدہ ہے کہ حیاتِ انسانی کا منبع و ماخذ واحد ہے۔ لہذا حیاتِ انسانی کرہ ارض کے کسی بھی خطہ میں پائی جاتی ہو اور کسی بھی ہیئت و تنظیم میں ہو، بنیادی طور پر واحد ہے۔ بعد مکانی اور تہذیبی و تمدنی اختلافات عارضی عینت میں

حقیقی نہیں، اور اس نفسیاتی ارتقاء کے دوران ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ جب وہ حضرت ابن عربی کے ہم زبان ہو کر پکار اُٹھتا ہے :-

لقد كنت قبل اليوم انكر صاحبى اذا لم يكن ديني الح دینه دانی
 وقد صار قلبی قابلاً لِسكل صورته فصرعى لغزلان و دیر لرهبان
 و بیت سیران و کعبه فاصد و الواح توراة و مصحف قرآن
 ادين بدين المحب انى توجهت رکاتبه فالحُب دینی و ایمانی

(آج کے دن سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ جس ساتھی کا دین مجھ سے نہ ملتا، میں اُس کا انکار کرتا اور اُسے اجنبی سمجھتا۔ لیکن اب میرا دل ہر صورت کو قبول کرتا ہے۔ وہ چرکاء بن گیا ہے غزلوں کی اور دیر راہوں کے لئے۔ آگ پوجنے والوں کا آتش کدہ اور حج کا قصد کرنے والوں کا کعبہ۔ تورات کی الواح اور قرآن کا صحیفہ۔ میں اب مذہبِ عشق کا پرستار ہوں۔ عشق کا قائد جدھر بھی مجھے لے جائے، میرا دین بھی عشق ہے۔ میرا ایمان بھی عشق ہے۔)

اس طرح نہ صرف وہ اس دنیا میں ہی ایک نیا انسان بن جاتا ہے بلکہ اُس کی داخلی نفسی زندگی میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں حیاتِ اخروی میں پہلے درجہ میں اُس کے نسیم پر۔ دوسرے درجہ میں اُس کی روحِ ملوٹی پر۔ اور تیسرے درجہ میں اُس کی ذاتِ بحت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور بالآخر وہ اپنی نوع کے امام سے جا ملتا ہے۔ اور امامِ نوع کے ساتھ متحد ہونے سے وہ براہِ راست ذاتِ باری تعالیٰ کی غیر ختمہ تجلیات کے جلو میں آجاتا ہے اور اس طرح وہ لقاءِ رب اور رویتِ باری تعالیٰ کی نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز ہو جاتا ہے جو حیاتِ انسان کا مقصودِ اولیٰ ہے۔

لہذا اس مثال سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عقائد اگر عمل میں تبدیل نہیں ہوتے تو وہ بے جان لاشیں ہیں، جن کے رکھ رکھاؤ کے لئے تو کچھ کیا جاسکتا ہے مگر اُن میں حیاتِ تازہ نہیں پیدا کی جاسکتی۔ اور نہ وہ حیاتِ انسانی کے تکمیل و تزکیہ کے لئے کوئی عمیق تبدیلی لاسکتے ہیں۔

اور پھر یہ عقیدہ پرستی ہی ہے جس کی وجہ سے تمام مذاہب میں نہ صرف باہمی طور پر شدید اختلافات پیدا ہوئے بلکہ یہ اپنی داخلی تنظیم میں بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ کل حزبِ بئالذینہم فرحون (قرآن حکیم)۔ اگر اس تفریق و انتشار کا کوئی علاج ممکن ہو سکتا ہے تو یہ صرف یہی کہ عقیدہ

کے ربط و تعلق کو از سر نو معاشرہ کے ارتقائی اور تخلیقی عمل سے تمام کر دیا جائے اور اسی معیار پر ہر گروہ اور ہر مذہب کے اعمال کو جانچا اور کسا جائے اور اس طرح ان تمام اعمال و عقائد کو الگ کر دیا جائے جو معاشرتی عمل اور تزکیہ نفس کے راستہ میں حارج ہیں اور صرف اسی طرح ہم مذاہب عالم کے اتحاد کی بنیادوں کو پھر سے استوار کر سکتے ہیں۔ جس سے مذاہب عالم ایک دوسرے سے الگ الگ متحارب و متخاصم گروہوں کی حیثیت ختم کر کے فطرت کے ایک ہی تخلیقی و ارتقائی عمل کی مختلف کڑیاں بن جائیں گے، جو اپنی غایتِ اولیٰ کو حاصل کرنے کے لئے ازل سے سرگرم عمل ہے۔

دوسری خصوصیت ہیئت و رسم پرستی

جس طرح مذہبی تقلیدی نظام میں عقیدہ کی نوک پیک درست کرتے رہنے، اُسے طوطے کی طرح رٹ لینے اور پھر مناسب مواقع پر اُس کو چسپاں کرنے سے اُسے زندگی کے ہر منہ کو حل کرنے کی کلید سمجھ لیا جاتا ہے۔ اسی طرح عبادت و اعمال کی ہیئت یعنی ارکان و رسوم ہی کوجس میں انہیں ادا کیا جاتا ہے، سب کچھ تصور کر لیا جاتا ہے۔ چاہے وہ عمل یا عبادت اُس نصب العین یا غایت کو پورا کرے یا نہ کرے، جس کے لئے اُسے وضع کیا گیا ہے۔

ہیئت یا رسم کا منصب یہ ہوتا ہے کہ وہ اُس غایت یا معنی کی حفاظت کرے، جس کے لئے اُسے وضع کیا گیا ہے۔ بذاتِ خود ہیئت یا رسم کی ادائیگی مقصود نہیں ہوتی۔ اگر ہیئت و رسم کے ظاہری ڈھانچہ کے رکھ رکھاؤ کو ہی نصب العین بنالیا جائے اور سمجھ لیا جائے کہ رسوم و ارکان کو اُن کے قواعد کے مطابق بجالانا ہی کافی ہے۔ تو معنی یا غایت کا حصول ممکن نہیں رہتا۔ غایت اور معنی تو تھی حاصل ہوگا، جب ان تمام اعمال کا مقصد اس کا حصول قرار دے دیا جائے اور رسوم و ہیئت کی صحت مندی کا معیار معنی یا غایت کے حصول کو تصور کیا جائے۔

ہیئت یا رسم سے معنی کا حاصل کرنا ایک شعوری عمل ہے اور شعوری عمل ہمیشہ ارادی ہوا کرتا ہے۔ جب تک معنی یا غایت کو حاصل کرنے کے لئے شعور و ارادہ کے ساتھ ہیئت یا رسم کی ادائیگی نہ کی جائے گی اس وقت تک اُس کا حصول ناممکن ہے۔

مثلاً صلوٰۃ کی غایت کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ یہ فحش و منکر باتوں سے

بچاتی ہے۔ اور تعلق باللہ کو قائم کرتی ہے۔ مگر بیعت و رسم پرستی کے مرض میں گرفتار ہونے کی وجہ سے ہمارے بیشتر علماء اور عام مسلمانوں کے نزدیک صلوٰۃ کی صحت ادائیگی اور حق تعالیٰ کے نزدیک اُس کی قبولیت کے لئے فحش و منکر سے اجتناب اور تعلق باللہ کو شرط قرار نہیں دیا جاتا۔ بلکہ ہاتھوں کا زیر ناف یا سینے پر باندھنا یا کھلے چھوڑ دینا، آمین بالجہ کہنا یا خفی، فاتحہ خلف امام پڑھنا یا نہ پڑھنا اور ایسے ہی دیگر ظاہری اعمال و رسوم کو بجالانے پر نہ صرف زور دیا جاتا ہے بلکہ ان خواہر کے اختلاف پر فساد بھی برپا کیا جاتا ہے۔ چونکہ مذہبی تقلیدی نظام نے نماز پڑھنے والوں کو اس کی غایت اور مقصد سے آگاہ ہی نہیں کیا لہذا نتیجہ یہ ہے کہ خود نماز ادا کرنے والا اپنے آپ کو اس قرآنی معیار یا شرط کا پابند نہیں سمجھتا بلکہ اندھا دھند میکانیکی طور پر چند حرکات بجالانے کو ہی نجاتِ آخر دی کے لئے کافی تصور کر لیتا ہے۔

یہی حال وضو کا ہے۔ برس برس تک وضو کرتے رہنے سے صاحب وضو کے نفس میں طہارت و پاکیزگی کی قدر راسخ نہیں ہوتی، وہ صرف وضو کے ظاہری شرائط کو بجالانا ہی مقصود وضو تصور کر لیتا ہے۔

اسی بیعت و رسم پرستی کا ہی نتیجہ ہے کہ ازمنہ و سطلی کے معاشرہ کے مقابلہ میں آج کے معاشرہ کی بناوٹ اور ترکیب میں بنیادی اور واضح تبدیلی آجانے کے بعد بھی ہمارا مذہبی طبقہ زکوٰۃ کی شرح کو تبدیل کرنا بدعت و نفاق تصور کرتا ہے۔ اس متشدد رسم پرستی سے چاہے زکوٰۃ کا ادارہ ہی ختم ہو جائے جیسا کہ عملاً ہو رہا ہے مگر اُس میں کسی قسم کی تبدیلی منظور نہیں کی جاتی۔

اس نظام کی رُوح چونکہ تقلیدی ہوتی ہے تحقیقی اور تخلیقی نہیں، اس لئے عقیدہ کا صرف زبانی اقرار کر لینا اور رسوم و ارکان کو میکانیکی طور پر ادا کر لینا ہی نجاتِ آخر دی کے لئے کافی سمجھ لیا جاتا ہے اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی کو برداشت نہیں کیا جاتا، اور انہیں بجا رکھنے پر اصرار ہوتا ہے، کیوں کہ تبدیلی کو تسلیم کرنے کا معنی ہی ہے کہ میکانیکیت کی بجائے تخلیقیت اور تحقیق کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور تخلیق و تحقیق کو بطور اصول کے تسلیم کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ مذہبی ذہن نے اپنی تابانہ حیثیت سے خود ہی ہاتھ اٹھائے ہیں اور جدید ذہن اور نئے تقاضوں کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے اور یہ بات تو عیاں ہے کہ وہ کسی طرح بھی اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ اُس کے وجود کی نفی کے مترادف ہے۔ (مسلصے)